

افریقہ: غیر ملکی امداد کی تباہ کاریاں

مسلم سجاد

(ماہنامہ 'World & I' مئی ۹۷ میں مائیکل مارین (Michael Maren) کی کتاب: Road to

Hell پر لکھا کے 'جارج آئیٹے نی (George Ayittey) کے تبصرے: ہمدرد گدہ (Compassionate

Vultures پر مبنی)۔

افریقہ گذشتہ کئی برسوں سے بحران در بحران کا شکار ہے۔ معیشت تباہ ہو رہی ہے اور ریاستیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ قتل و غارت، بھوک اور قحط کے ناقابل یقین مناظر نظروں کے سامنے آتے ہیں تو ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ بے قصور عوام کو استعمار سے آزادی کے یہ کڑے کھیلے پھل کیوں مل رہے ہیں؟ برونڈی، ایتھوپیا، لائبیریا، روانڈا، صومالیہ، زائرے، ہر جگہ ایک ہی کہانی ہے۔ لکھو کھانا گزین، عورتوں اور بچوں کے ہجوم کے ہجوم، در بدر ہیں۔ ان کے ملکوں میں خانہ جنگی ہے، لوٹ مار ہے، انتشار ہے، ظلم ہے۔ ان کی مدد اور نجات کے لیے مغربی ممالک کی ریلیف ایجنسیاں میدان میں آ جاتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ سے خوف ناک دنوں کو ہلا دینے والی تصاویر دکھا کر امداد کی اپیلیں کی جاتی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بچہ سڑک کے کنارے پڑا ہے، اس کے چہرے پر کھیاں بھنھننا رہی ہیں اور قریب ہی چند گدہ اس کے مرنے کے انتظار میں چکر لگا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ بچہ، افریقہ کے مصائب کی علامت ہے اور گدہ، مغربی این جی اوز، اجناس کے امریکی تاجر، اسلحہ کے بیوپاری، اور خیراتی ادارے ہیں۔ پناہ گزینوں کی مدد کرو، بھوکوں کو کھانا کھاؤ، کے نعرے، دراصل منافع خوروں کے حقیقی مقصد کو ڈھانکنے والے مقدس لبادے ہیں، فائدہ کشوں اور ضرورت مندوں کی اپنی حیثیت ٹانوی ہے۔ ان کی تفصیلات پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے۔ جب مغربی کینیا کے علاقے ترکانا میں قحط کی صورت حال پیدا ہوئی تو کیتھولک ریلیف سروس کے ڈائریکٹر نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب ہمارے لیے اپنا کام بڑھانے کا موقع ہے!

دراصل امریکہ کے کاشت کار، حکومت سے زر تلافی حاصل کر کے جو فاضل غلہ پیدا کر رہے ہیں، اسے

تقسیم کرنے کے لیے حکومت امریکہ امدادی ایجنسیوں کو رقم دیتی ہے۔ جتنی زیادہ خوراک یہ تقسیم کرتے

ہیں، اتنی ہی زیادہ رقم امریکی حکومت سے ملتی ہے۔

بیرونی امداد معاشی ترقی کے نام پر دی اور لی جاتی ہے، لیکن کیا اس سے فی الواقع معاشی ترقی ہوئی ہے؟ کینیا کے ایک سابق ممبر پارلیمنٹ، ڈیوڈ کارانجا کا کہنا ہے: ”بیرونی امداد نے افریقہ کو اس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، جتنا ہم تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے افریقہ، اپنی ترقی کی سمت اور رفتار کا فیصلہ اپنی ترجیحات کے مطابق نہیں کر سکا ہے۔ آج افریقہ کے ترقیاتی منصوبے ہزاروں میل دور ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے دفاتر میں تیار کیے جاتے ہیں۔ جہاں کے ماہرین افریقہ کی حقیقی صورت حل سے نابلد ہوتے ہیں“ (نیو امریکن، جون ۹۳ء، ص ۲۰)۔

Road to Hell کا مصنف بتاتا ہے کہ بیرونی امداد کے منصوبوں میں کام کرنے والے امریکی عموماً اس کے جیسے ناکام شادیوں اور ٹوٹے ہوئے خاندانوں کے نوجوان ہوتے ہیں۔ وہ خود کچھ عرصے کینیا میں استاد رہا، پھر جب کیتھولک ریلیف سروس کو منصوبہ: ”کام کے بدلے غذا“ شروع کرنے کے لیے ۹ لاکھ ڈالر کی گرانٹ ملی تو وہ اس کا پراجیکٹ ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ زراعت، جنگلات، سڑکوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، ڈیم کی تعمیر کی الف ب بھی نہ جانتا تھا لیکن ان منصوبوں کی منظوری دیتا تھا۔

جتنی تفصیلات میں جائیں، صورت حل خوف ناک تر ہوتی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قابل نفرت توفیق زوہ بچوں کو عطیات حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ امدادی کارروائیاں ایک صنعت کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، جن میں مغربی خیراتی ادارے، غلے اور اسلحے کے تاجر اور امریکی قانون ساز ملی بھگت کر کے منافع سمیٹتے ہیں۔

مارین کے مطابق: ”یو ایس ایڈ کے ۸۰ فی صد ٹھیکے اور عطیات امریکی کمپنیوں کو دیے جاتے ہیں جو پھر انھیں ضرورت مند ممالک میں تقسیم کرتے ہیں۔ جب ایک ممبر کانگریس نے بیرونی امداد پر اعتراض کیا کہ یہ امریکی ٹیکس گزار کی رقم کو بیرونی چوہوں کے بل میں پھینکنے کے مترادف ہے تو یو ایس ایڈ کے ایک افسر نے جواب دیا: ”یہ بل ان کا اپنا ڈسٹرکٹ بھی ہو سکتا ہے“ (لاس اینجلس، ٹائمز، اکتوبر ۹۵)۔

۱۹۹۳ میں امریکی این جی اوز کو یو ایس ایڈ سے ۱۶۹ ارب ڈالر ملے۔ ان رقومات کے سلسلے میں عموماً جواب دہی کا نظام نہیں ہوتا۔ نوکر شاہی کا پہلا اصول خود اپنے کو مضبوط کرنا ہوتا ہے، اس لیے رقومات کا بیشتر حصہ تنخواہوں اور کرایوں میں جاتا ہے۔ ایک خیراتی ادارے کے سربراہ کو ۲ لاکھ ڈالر معلوضہ اور ۲ ہزار ڈالر رہائشی الاؤنس دیے جاتے ہیں۔ ورلڈ بینک کے ایک سابق افسر کے مطابق: ”بینک کے منصوبے عموماً سرکاری پروگرام کی حیثیت سے ہوتے ہیں جن میں چوری، رشوت اور کرپشن کے نت نئے طریقے رائج ہیں۔ نقد رقم سے کرپٹ حکمران طبقے کو تقویت ملتی ہے اور تباہ کن سوشلسٹ پالیسیاں جاری رہتی ہیں۔ اس طرح ورلڈ بینک دراصل کرپٹ، ظالم اور سفاک حکومتوں کا ساتھی بن جاتا ہے“ (واشنگٹن ٹائمز، جون ۲۰، ۱۹۹۵)۔

دوسری جنگ کے بعد امریکہ کا غلہ، مارشل پلان کے تحت یورپ گیا اور اس سے امریکی کاشت کاروں کے لیے خوش حالی کا دور آیا لیکن جب یورپ اپنی ضرورت خود پوری کرنے لگا، تو اب فاضل غلے کا کیا ہو؟ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے پاس غلہ خریدنے کے لیے ڈالر نہیں تھے، روپے اور تازے وغیرہ تھے۔ اس مسئلے کا حل، امریکہ نے پبلک لا ۴۸۰ نکالا۔ اس کا مقصد خود ہی صاف بیان کیا گیا ہے: ”امریکہ کی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے کے لیے فاضل زرعی اجناس کا زیادہ سے زیادہ موثر استعمال۔“

یہ طریق کار وضع کیا گیا کہ زرعی اجناس کی نجی تجارت ہو، اور مقامی کرنسی قبول کی جائے، حکومت امریکہ اس کے بدلے ڈالر فراہم کر دے اور مقامی کرنسی متعلقہ ممالک میں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرے۔ جلد ہی پی ایل ۴۸۰، دودھ دینے والی گائے بن گیا۔ اس کو برقرار رکھنے کے لیے مضبوط لابی بن گئی۔ تاجر، این جی اوز اور ریلیف ایجنسیاں سب ہی کے مفادات اس سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس کے ایک ممبر نے کہا کہ ہر ڈالر امریکہ کی معیشت کی بہتری پر صرف ہوتا ہے اور ٹیکس میں اضافہ کرتا ہے۔ امریکہ کی جہازوں کی کمپنیاں کیوں محروم رہیں؟ ۱۹۹۲ میں کانگریس نے ایک ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے ۷۵ فی صد اجناس امریکی جہازوں کی کمپنیوں کے ذریعے جانا لازمی تھا۔ ان کے نرخ بازار سے ۲ سے ۳ گنا زائد تھے۔ اس کی وجہ سے کارگو کے اخراجات میں ۱۹۸۹ سے ۱۹۹۳ تک فی سال ۵۷۸ ملین ڈالر کا اضافہ ہوا۔ یعنی رقم واپس امریکہ پہنچنے لگی۔ مارین کے مطابق: ”امریکی این جی اوز، فوج اور بحری دستوں کی طرح شروع سے امریکی خارجہ پالیسی کے آلات ہیں۔“

ان ماہرین سے اور اس امداد سے کینیا، صومالیہ، روانڈا اور زائرے کے شہریوں کو کیا حاصل ہوا؟ ”مفت غلہ ٹنوں کے حساب سے آیا تو مقامی کاشت کار اپنے کام سے گئے۔ چند ہی این جی اوز نے مقامی ڈاکٹروں، انجینیروں یا دوسرے لوگوں کو ملازمت دی۔ عموماً باہر سے افراد لانے کو ترجیح دی۔ اقوام متحدہ نے بیرونی این جی اوز کو لاکھوں دیے جب کہ مقامی این جی اوز کو کام چلانا بھی مشکل رہا۔“

افریقہ کے انسانی مصائب سے صرف امریکی این جی اوز ہی فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے، اطالوی، برطانوی، فرانسیسی، کینیڈین کوئی بھی پیچھے نہ تھا۔ صومالیہ میں اقتصادی اور ہنگامی امداد کے ڈھیر لگ گئے۔ ایک بیان کے مطابق صومالیہ کو امداد کا قبرستان بنا دیا گیا۔ ایک اطالوی صحافی کے بیان کے مطابق: ”اطالوی سوشلسٹوں نے صومالیہ میں کروڑوں ڈالر فراہم کر دیے اور چند استثنائی صورتوں کے علاوہ سب فضول اور بے کار منصوبے تھے“ (واشنگٹن پوسٹ، ۲۳ جنوری ۱۹۹۳)۔

۱۹۸۱ سے ۹۰ کے درمیان، ایک ارب ڈالر کے ۱۱۳ منصوبوں کے لیے اطالوی تعمیراتی اور انجینئرنگ کمپنیوں کو ٹھیکے دیے گئے جنہوں نے روم میں حکمرانوں کو رشوتیں دیں۔ صومالیہ کے صدر سعید بارے

نے امداد سے اسلحہ خرید کر اپنے ہی عوام سے جنگ کی۔ اس کے بیٹے کرنل حسن محمد بارے نے جس کے ہاتھ میں امداد کی رقم آئی تھیں، سوئزرلینڈ میں جاہداد اور بنک بیلنس بنائے۔ صومالیہ میں ہر طرح کے مظالم اور آمریت کے باوجود اٹلی سعید بارے کی مکمل حمایت کرتا رہا۔ جب حزب اختلاف کے ایک ممبر نے اسمبلی میں کہا کہ اٹلی آمروں کی سرپرستی کر رہا ہے تو وزیر خارجہ نے کہا: ”اگر ہم آمروں کا ساتھ چھوڑ دیں تو افریقہ میں کوئی ملک تعاون کرنے کے لیے نہ بچے گا۔“ جب ۱۹۹۱ میں صومالیہ میں بحران پیدا ہوا تو این جی اوز کا ہجوم صومالیہ میں اٹل آیا۔ کیوں؟ امدادی رقم موجود تھی اس لیے وہ آئے۔ حکومت کے لیے اس میں خوب فائدہ تھا۔ زیادہ این جی اوز کا مطلب موگا دیشو میں زیادہ صدر دفاتر اور شہر کے زیادہ تر اعلیٰ مکانات، سعید بارے کے رشتے داروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کے تھے۔ دوسرے شہروں میں بھی غیر معمولی کرایوں پر یہ مکانات حاصل کیے گئے۔

این جی اوز کا مفاد اس میں تھا کہ مصیبت زدگان کی تعداد زیادہ ہو۔ World Vision، Oxfam، Save the Children، CRS، CARE کو یو ایس ایڈ اور پی ایل ۴۸۰ سے ملنے والے عطیات کی رقومات کا تعین بچوں یا متاثرہ افراد کی تعداد پر ہوتا تھا۔ صومالی معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کی ذمے دار ۹۰ کے عشرت کے اوائل کی غیر معمولی غذائی امداد تھی۔ قحط افریقہ کے لیے نئی چیز نہیں۔ مقامی طور پر اس کا مقابلہ کیا ہی جاتا تھا۔ اب صومالیہ کا مکمل انحصار غذائی اشیاء کی درآمد پر ہو گیا۔ یہ انحصار ۳۳ فی صد سے بڑھ کر ۶۳ فی صد اور پھر اس سے بھی زیادہ ہو گیا۔ غذائی اجناس کی قیمتیں کم ہونے سے مقامی کاشتکاروں نے فصلیں کم کر دیں۔ مقامی لوگوں کے لیے بھی پناہ گزینوں کے مراکز کے سامنے قطار لگانا آسان تھا۔ ایک صومالی عبدالرحمن عثمان نے شاکی انداز میں کہا: ”خوراک کے لیے امداد نے ہمارے سٹم کو تباہ کر دیا۔ ہم کبھی بھی غذائی امداد کے محتاج نہ تھے لیکن ماضی میں ایک سٹم تھا۔ وہی لوگ شہروں میں آ کر قرض لیتے جو اچھے وقتوں پر ادا کر دیتے۔“

اصل ضرورت مندوں تک کتنی امداد پہنچتی تھی؟ ۱۹۹۴ میں Save the Children کے لیے دیے گئے ڈانروں میں سے فیڈ میں کل ۴۵۶۱ ملین ڈالر پہنچے۔ اس کا نصف دوسری تنظیموں کو دیا گیا جن کے اپنے تنخواہوں نے اور دیگر اخراجات تھے۔ اس طرح اصل کا بہت کم فی صد اصل مقصد کے لیے صرف ہوا جب کہ سب منصوبے بھی مفید اور مناسب نہیں تھے۔

افریقہ میں خاندانی نظام کی وسعت اور استحکام کی وجہ سے کوئی ”یتیم“ نہیں ہوتا۔ جس بچے کے اپنے والدین نہ ہوں اسے کوئی چچا، پھوپھی، کوئی تایا زاد، کوئی دور کارشتے دار بطور سرپرست مل جاتا ہے لیکن ایک

۳۰، ۳۰ یتیم جمع کیے گئے اور قبیلے کے بڑوں کے احتجاج کے باوجود انھیں ٹرک میں ڈال کر موگاڈیشو میں کسی یتیم خانے میں لے گئے۔

کچھ بھی کہا جائے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صومالیہ میں بین الاقوامی برادری نے ۳۶۵ ارب ڈالر خرچ کیے لیکن کچھ بھی حاصل نہ کیا۔ روانڈا میں نومبر ۹۶ میں زائرے کے بحران سے قبل تک جس میں ۶ لاکھ ہوٹو واپس روانڈا پہنچ گئے، مہاجر کیپوں پر روزانہ ایک ملین ڈالر خرچ ہو رہے تھے۔ اب تک ۹۰۰ ملین ڈالر خرچ ہو چکے ہیں لیکن نتیجہ؟

دراصل مسائل کا اصل حل یہ ہے کہ بحران کو پیدا ہونے سے روکا جائے نہ کہ بیٹھ کر انتظار کیا جائے کہ کب بحران پیدا ہو اور نیچے، کبل اور بسکٹ لے کر دوڑ پڑیں۔ لیکن یہ حل خود افریقہ کے اندر سے آنا ہو گا۔ یورپ مارشل پلان کے بعد خود کفیل ہو گیا اسی طرح افریقہ میں بھی، اگر وہ اپنی خوراک خود پیدا کرے، کسی مدد کی ضرورت نہ ہو گی، جیسا کہ وہ ۵۰ کے عشرے میں کرتا تھا۔ لیکن خانہ بنکیوں، آمرانہ حکومتوں اور تباہ کن زرعی پالیسیوں نے افریقہ کی زراعت تباہ کر دی۔ خانہ جنگیاں اس لیے ہیں کہ افریقی آمرانہ تخت چھوڑتے ہیں نہ عوام کو اقتدار میں شریک کرتے ہیں۔ اگر افریقہ کے آمر، سیاسی اقتدار میں عوام کی شرکت گوارا کرتے، تو ان ملکوں کے عوام ان آفتوں سے بچ جاتے۔ ان ملکوں کی افواج نے خود اپنے ملکوں کو تاراج کیا۔ الجزائر، بروٹزی، ایتھوپیا، گیمبیا، گنی، لائبیریا، نائجر، نائیجیریا، روانڈا، سیرالیون، صومالیہ، یوگنڈا، زائرے، ہر جگہ ایک ہی کہانی ہے۔ فوج نے قبضہ کیا، عوام کو بے دخل کیا، لوٹ مار کی اور ملک تباہ کر دیا۔ ایک تجویز یہ دی جاتی ہے کہ ان ملکوں سے فوج ختم کر دی جائے جیسے کاسٹاریکا میں کوئی فوج نہیں۔

ایک راستہ یہ بھی ہے کہ ان فوجی حکمرانوں کو مغرب سے مدد نہ ملے اور مغرب ان ممالک میں حقیقی جمہوری نظام سے اپنے مغلوات وابستہ کرے۔ لیکن یہ ان ممالک کے عوام کا خواب اور تمنا ہو سکتی ہے۔ حقائق کی دنیا اور تاریخ کی کہانی کچھ دوسری ہی ہے۔ مغرب جمہوریت کا علم بردار ہے لیکن صرف اپنے لوگوں کے لیے۔

حیرت ہوتی ہے کہ پاکستان میں کسی جامعہ نے، تحقیقی ادارے نے، یا محب وطن سکالر نے امریکی اور دوسری غیر ملکی امداد اور قرضوں کے معاشی، دفاعی، تعلیمی، سیاسی اور اخلاقی صورت حال پر اثرات کا تحقیقی مطالعہ آج تک کیوں نہ کیا۔ کیا اس لیے کہ اس کے لیے امریکی امداد نہ ملی!